ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

سخنِ سادہ کی دلفریبی

تبصرہ پر کتاب

غالب اور رنگین کے فارسی مکتوبات

مترجم و مرتب پرتو روہیلہ

شائع کردہ: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

غالب کی عام شہرت بطور شاعر اور اردو کے ایک منفرد اسلوبِ نثر کے موجد کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے فارسی خطوط میں بھی حیرت سامانیوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ ان کے اردو خطوط کا زمانہ ۴۹-۱۸۴۷ء سے تادم مرگ (۱۸۶۹ء) بیس بائیس برس پر پھیلا ہوا ہے، جب وہ بطور شاعر بتدریج خاموش ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن ان کے فارسی مکاتیب کا عرصہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۶۸ء کو محیط ہے۔ فارسی مکاتیب کو نہ صرف زمانی تقدم حاصل ہے بلکہ ان کا زمانی پھیلاؤ بھی اردو خطوط سے زیادہ ہے۔ ان فارسی مکاتیب میں غالب کی زندگی کے بحرانوں اور تصورِ شعر و ادب کے وہ تمام رنگ ملتے ہیں جن سے ہماری زیادہ واقفیت ان کے اردو خطوط کے ذریعے ہوتی ہے۔ گو اس میں غالب کی منفرد اردو نثر کا بھی بڑا کردار ہے لیکن ہمارے اندر فارسی شعر و نثر کا جو زوال ہوا ہے اس کی وجہ سے بھی ہم غالب کی فارسی شاعری اور فارسی نثر کی تحسین سے محروم ہو گئے ہیں۔

ہمارے عام ادبی ماحول میں فارسی زبان کے اس بگڑتے ذوق کے پیشِ نظر جن ماہرین غالب نے آج کے غالب پسندوں کو غالب کی فارسی شاعری اور مکاتیب کی خوبیوں سے قریب لانے کی کوششیں کی ہیں ان میں پرتو روہیلہ کا نام بہت ممتاز ہے۔ انہوں نے غالب کے کم و بیش تمام فارسی خطوط کو اردو کے قالب میں ڈھال کر ایک بڑے سائز کی کلیات میں یکجا کر دیا ہے۔ ہماری زیرِ نظر کتاب غالب اور غمگین کے فارسی مکتوبات بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس میں فاضل مرتب/مترجم نے غالب کے ایک بزرگ معاصر میر سید علی غمگین کے نام غالب کے دس اور غالب کے نام غمگین کے چار فارسی مکتوبات کے اردو ترجمے مع ان کے فارسی متن کے جمع کر دیتے ہیں۔ پرتو روہیلہ صاحب نے محض جمع و تدوین اور ترجمہ و تحشیہ ہی کا کام نہیں کیا بلکہ ان مکتوبات میں زیرِ بحث مسائل و معاملات اور ان سے ابھرنے والے کچھ اہم سوالات پر ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اس طرح ان کی حیثیت محض مترجم اور مدوِّن کی نہیں بلکہ ایک محقق اور اس سے آگے بڑھ کر ایک تعبیر کنندہ کی بھی ہو جاتی ہے۔

انتظار حسین نے غالباً انشاء اللہ خان انشا کی کسی کہانی کی تدوین کرتے ہوئے کچھ ایسے امور کی طرف توجہ دلائی تھی جو ہمارے بہت سے محققین کے لیے نشانِ راہ ہونے چاہییں۔ انتظار حسین نے لکھا تھا کہ اگر آپ نے کسی پرانے کرم خوردہ مخطوطے کو دریافت کر کے اسے نئے حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع تو کروا دیا مگر یہ نہ بتایا کہ اس مخطوطے کا ہماری معاصر ادبی و علمی صورتحال کے

ساتھ کیا تعلق ہے یا یہ ہمارے موجودہ مسائل و سوالات کے ساتھ کیسے ہم آہنگ ہے یا اس اشاعت سے مسئلہ زیر بحث کا کوئی نیا پہلو کیسے سامنے آتا ہے تو اس طرح تو وہ مخطوطہ کچھ عرصے کے بعد پھر پردہ گم نامی میں چلائے جائے گا۔ گویا ایک محقق اپنی تنقیدی بصیرت سے کام لے کر اپنے نو دریافت متن کا جب تک عصری راطلاق یا اس کی نئی معنویت نہیں واضح نہیں کرتا تو اس کی تلاش و تحقیق کوئی بڑا کارنامہ نہیں بن سکتی۔

اپنی اس نئی کتاب میں پرتو روہیلہ نے غالب کے ان خطوط کے ترجمے، تحقیق اور تدوین کے ساتھ ساتھ غالب اور غمگین کے تعلق اور ان کے مخصوص میلانات ور جحانات کی روشنی میں کچھ ایسی تعبیرات بھی پیش کی ہیں۔ جن سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے مگر تعبیر کنندہ کی نکتہ رسی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ حضرتِ غمگین اپنے وقت کے ایک بڑے روحانی پیشوا تھے اور غالب کا ان سے عقیدت وارادت کا تعلق تھا۔ غالب کے خطوط میں غمگین کی عقیدت ومودت کا اظہار کچھ ایسے اسلوب میں ہوا ہے کہ اس سے بعض محققین نے ان دنوں کے مابین پیری مریدی کا تعلق دریافت کر لیا۔ پرتو روہیلہ نے اپنے نہایت ہی تجزیاتی مقدمے میں ان امور کی تحلیل اس دور کے عمومی مذاقِ تحریر کی روشنی میں کر کے واضح کیا فریقین کے مابین دوطرفہ احترام کا تعلق تو حد درجہ تھا مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غالب جیسا آزادہ رو حضرت غمگین کے دست حق پرست پر بیعت بھی ہو چکا تھا یا یہ کہ غالب ان سے اصلاح بھی لیتا تھا۔ فاصل مرتب نے اپنا موقف بیان کرتے ہوئے نکتہ نکالا ہے وہ توجہ کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں کہ اس طرح کے نتائج اس دور کی انتہائی مہذب ثقافت اور اس کے پرپیچ طرز اظہار کو نہ سمجھنے سے وجود میں آئے ہیں بلکہ اس رو سے غالب کے فارسی خطوط پر مبنی پانچ مداول کتابوں میں بکھری ساری انشا نگاری بھی داد سے محروم رہی۔

خطوط کے اردو ترجمے میں مترجم نے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کی داد دو وجوہ سے ضروری ہے۔ ایک تو اصل فارسی متن کی پاس داری کے سبب اور دوسرے (اور یہ پہلو میرے اعتبار سے زیادہ اہم ہے) ترجمے کی نثر کو ادبی رکھتے ہوئے بھی سادگی کی روش اپنائی گئی ہے۔ یاد رہے کہ یہ غالب کے اردو خطوط والی سادگی نہیں جس کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اس سلاست میں بھی اتنی پیچیدگی ہے کہ آج کا عام بڑا لکھا نوجوان تو اسے روانی سے پڑھ بھی نہیں سکتا۔ سمجھنا تو دور کی بات ہے۔ بلکہ مترجم کی نثر ایسی سادہ ہے جو نہ تو علمیت کے بوجھ تلے دبی ہوتی ہے اور نہ اس میں غالب کے اردو خطوط کی نثر کی بے رنگ نقالی کی کوشش نظر آتی ہے، جس کی اگرچہ یہاں پوری گنجائش تھی اور پرتو صاحب کی سطح سے کم تر کوئی آدمی شاید اس ترغیب سے خود کو بچا نہ سکتا۔ مگر اس طرح کی کوشش رنگِ غالب پیدا کرنے کے بجائے عموماً مضحکہ خیزی کی صورت بن جاتی ہے۔ پرتو صاحب نے نہ تو غالب کی بھاری بھرکم تراکیب کو علیٰ حالہٖ باقی رکھنے کی کوشش کی ہے اور نہ اپنی اردو نثر کو اتنا بے تہہ بنایا کہ بات عامیانہ سطح پر اتر آئے۔ پھر خطوط وحدانی میں انہوں نے جو وضاحتی کلمات و الفاظ استعمال کئے ہیں وہ اس خوبی کے حامل ہیں کہ جملہ ان کے بغیر بھی معنی دیتا ہے اور انہیں اگر جملہ کا حصہ مان کر پڑھا جائے تب بھی فقرے کی ساخت اور روانی مجروح نہیں ہوتی۔ یہ مترجم کی دوہری کامیابی ہے۔

ایک شے جس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ زیر تبصرہ کتاب میں غلطیوں کی حد تناسب سے بڑھی ہوئی شرح ہے۔ میرے لیے کتاب کے ہر جز کا پوری طرح جائزہ لینا بوجوہ ممکن نہیں تھا مگر پھر بھی جہاں جہاں اردو عبارت کے مفہوم میں در آنے والی کسی رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے اصل فارسی متن سے موازنہ کیا تو معلوم ہوا دونوں جگہ اپنے اپنے انداز کی غلطیاں ہیں۔ میں

صرف خط نمبر تین کے ایک آدھ مقام کی طرف توجہ دلاؤں گا جو اپنی جگہ اس اعتبار سے اہم خط ہے کہ اس سے غالب کی ابن عربی کے عارفانہ مسائل میں دلچسپی اور ان کی لفظیات کے غیر معمولی استحضار کا اندازہ ہوتا ہے۔ص ۴۲ پر ایک جملہ ہے کہ ''اعیان ثابتہ کا وجود مطلق کے ساتھ ہی تعلق ہے جو خطوط شعاع کا آفتاب کے ساتھ اور نقوش امواج کے دریا کے ساتھ''۔ یہاں ''جو'' کا کلمہ اس بات متقاضی ہے کہ جملے میں ''ہی'' کے بجائے ''وہی'' ہو۔ پھر اسی جملے کا کچھ حصہ جب مقدمے میں ص ۲۴ پر آیا ہے تو اس طرح ہے کہ ''اعیان ثابتہ کا وجودِ مطلق ہی کے ساتھ تعلق ہے''۔ یہ دونوں اگر ایک ہی جملے کی صورتیں ہیں تو انہیں یکساں ہونا چاہیے۔ پھر ص ۴۳ پر ایک جملہ ہے کہ ''وقت نہیں ہے بلکہ عین ثابتہ وقت ہے مکان کی صورت.....'' یہی جملہ مقدمے میں ص ۲۴ یوں نقل ہوا ہے کہ ''بلکہ عین ثابتہ وقت ہے بے مکان کی صورت''، اسے بھی صحیح کیا جانا چاہیے۔ میں طوالت کے خوف سے پوری عبارتیں نقل نہیں کرسکتا صرف اتنا عرض کروں گا کہ اسی مکتوب میں ص ۴۳ پر جو جملہ ''(درحقیقت) آسمان نہیں یہ فلک کا عین ثابتہ ہے سے شروع ہوتا ہے اس کو جب اصل فارسی متن ص ۹۶ سے موازنہ کرکے پڑھیں تو لگتا ہے کہ یا تو اردو ترجمے میں اضافہ ہے یا پھر فارسی متن میں بہت کچھ گم ہوگیا ہے۔ اسی طرح ص ۹۰، ۳۹، ۳۶ پر بھی معاملات ہیں جہاں ایک جگہ ''میں تو جانتا تھا کہ اس لطیفے سے ذوق (سخنِ) ابھرے.....'' یہاں مفہوم کے اعتبار سے 'جانتا' کے بجائے 'چاہتا' ہونا چاہیے تھا کہ اصل متن میں 'خواستم' ہے۔ دیکھئے ص ۳۶، ۸۹۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ صرف ان جگہوں کا معاملہ جو اتفاقاً نظر میں آگئی ہیں۔

معروف مسیحی عالم اور عارف سینٹ ٹامس ایکیوناس کا ایک واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ان کے ایک دینی بھائی بیماری ٹامس میں ان کی عیادت کے لیے آئے تھے، ان سے ازرہ مذاق کہا کہ ''وہ دیکھو ایک بیل کیسا مزے سے اڑا جا رہا ہے۔'' ٹامس، باوجود اپنی بیماری اور لاغری کے بشمکل تمام اٹھے اور کھڑکی کے پاس آئے تو دینی بھائی نے کہا ''واہ ٹامس اتنا بھی معلوم نہیں کہ بیل اڑا نہیں کرتا''! سینٹ ٹامس نے بڑے رسان سے جواب دیا کہ'' اپنے ایک دینی بھائی کو جھوٹا سمجھنے سے بہتر ہے کہ ایک بیل کو جھوٹا سمجھ لیا جائے''۔ سینٹ طامس کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے مناسب ہے، ان غلطیوں کو غالب یا فاضل مرتب و مترجم کے کھاتے میں ڈالنے کے بجائے کتابت والی بے جان مشین یعنی کمپیوٹر کے کھاتے میں ڈال کر اسے ہی جھوٹا سمجھا جائے،..... یہ یقیناً کمپوزنگ کی غلطیاں ہوں گی مگر ایسے ادق امور میں جب کمپوزنگ کی غلطیاں بھی آجائیں تو مفہوم نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

وہ جو اقبال سے منسوب معروف بات ہے کہ ''تصوف کا وجود ہی کی اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے'' مگر اس جملے کا اصل سے موازنہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ اقبال کا جملہ یہ تھا ''تصوفِ وجودی اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے''۔ تو کمپوزنگ / کاتب کی غلطیاں بعض خطرناک نتائج تک پہنچا دیتی ہیں۔ غالب کے اس خط میں بھی یہی تصوفِ وجودی، جسے عرف عام میں وحدۃ الوجود کا نظریہ کہا جاتا ہے، زیر بحث ہے۔ ان خطوط سے ہم جہاں غالب کے دیگر بہت سی جہتوں سے آشنا ہوتے ہیں وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ غالب کو ابن عربی کے ان مسائل اور ان کی لفظیات سے نہ صرف کامل آگاہی تھی بلکہ وہ اپنے زمانے کے ایک معروف صوفی کے سامنے ان امور پر بے تکلفانہ گفتگو بھی کرسکتے تھے۔

اس کتاب سے قاری کو نہ صرف غالب کے فارسی خطوط اور ان کے تراجم سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ غالب کے مکتوب الیہ میر سید علی غمگین کے مقام و مرتبے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ فاضل مترجم نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''حضرت غمگین کی شخصیت بوجوہ تا حال

عام اردو قاری سے غیر متعارف رہی ہے'' اس کمی کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے کتاب میں دس ضمائم کا اضافہ بھی کیا ہے۔ جس سے کتاب کی اہمیت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ فاضل مرتب و مترجم اگرچہ ایک طویل عرصے سے غالبیات کے شغف میں لگے ہوئے ہیں مگر اپنے دیباچے میں انہوں نے نہایت معروضی رویہ اختیار کرتے ہوئے ایک فلسفی شاعر اور ایک عارف باللہ کی باہمی مکاتب سے متبادر ہونے والے مسائل کا تجزیہ نہایت ٹھنڈے انداز میں کیا ہے۔ وہ جب غالب کی طرف داری کرتے ہیں تو سخنِ فہمی کی بنیاد پر اور جب غمگین کا موقف بیان کرتے ہیں معرفت شناسی کا ذوق ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

یوں لگتا ہے کہ ان کا دل تو غمگین کے ساتھ ہے مگر دماغ غالب کے ساتھ اور یہ رویہ ہمارے زمانے کے ہر اس صاحب دانش کا ہوتا ہے جو دماغ کو معطل کئے بغیر باطنی واردات کی حقیقت جاننا چاہتا ہے۔

آخر میں میں ایک خاص امر کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں جو غالب کے خطوط کے مندرجات میں بہت نمایاں ہے۔ یہ طے ہے کہ حضرت غمگین اپنے زمانے کے ایک بڑے صوفی اور عارف تھے اور غالب ایک رندمشرب شاعر۔ ایک ایسا شاعر جس کے باطن میں اپنے روایتی علوم و معارف کے لیے تشکیک پیدا ہوچکی تھی۔ مگر جب وہ شاعر ''پیرومرشدِ ترحق''، ''مرکز خاطر''، ''مرشد قدسی'' اور ''قبلہ دیدہ دل'' سید علی غمگین سے خطاب کرتا ہے تو دیدہ و دل فرش راہ کر دیتا ہے اور مرشد کے قدموں میں جان نچھاور کرنے اور ان کے گرطواف کرنے کی آرزو کرتا ہے مگر جب ان سے اختلاف کا معاملہ آتا ہے تو احترام وعقیدت کے جملہ صیغے صرف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''میں جناب کا فرمانبردار ہوں لیکن اس ضمن میں عقل کا فرمان یہ ہے.....'' (ص۳۴)۔ غالب کی اس روشِ تنقید اور اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے صیغہ احترام ملحوظ رکھنے کے آداب میں آج ہمارے لیے سیکھنے کا بہت سامان ہے۔